R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
per Copy-12

جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۴۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ ر دسمبر ۱۹۶۷ء

اداریہ

ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے

"ہماری زبان" انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار ہے۔ اس کا بنیادی مقصد اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے فضا ہموار کرنا ہے اس لیے یہ اردو زبان کی موجودہ حالت، اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹوں، اس کی مقبولیت کے اسباب پر برابر اظہار خیال کرتا رہتا ہے۔ یہ انجمن کی سرگرمیوں اور اس کی شاخوں کی سرگرمیوں کی اطلاعات مہیا کرتا ہے۔ یہ اردو ادب کے خاص خاص پہلوؤں پر بھی برابر روشنی ڈالتا رہتا ہے۔ اس میں تحقیق بھی ہوتی ہے اور تنقید بھی۔ اس میں مراسلات کے ذریعہ سے اہم مسائل پر اظہار خیال ہوتا ہے۔ اس میں سوالات کے ذریعہ سے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس میں کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے ہیں اور نظمیں اور غزلیں بھی۔ اس کے اداریوں میں عموماً اردو زبان و ادب کے متعلق اظہار خیال ہوتا ہے مگر کبھی کبھار ان تہذیبی اور علمی مسائل پر بھی جن کا زبان و ادب سے کسی نہ کسی طرح تعلق ہے۔ یہ اردو زبان و ادب کے مسائل پر قومی نقطۂ نظر سے خصوصاً اظہار خیال کرتا ہے مگر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب اور عالمی ادب کے اہم کارناموں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس اخبار کے صفحات بڑھائیں۔ اس میں کچھ خاص کالم رکھیں، اس میں تصویریں اور کارٹون بھی دیں کیونکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اردو کے ایک اچھے ہفتہ وار اخبار میں ان چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ انجمن کا یہ اخبار ان اضافوں کے ساتھ اردو اور انجمن کی زیادہ خدمت کر سکے گا۔

اب تک ہم نے ہماری زبان کی قیمت جان بوجھ کر بہت کم رکھی۔ چار روپے سالانہ میں یہ اخبار اپنا خرچ پورا نہیں کر پاتا۔ ہر سال انجمن اس پر تقریباً دس ہزار روپیہ اپنی آمدنی میں سے صرف کرتی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اسے خود کفیل بنا دیں۔ اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ اس کے کم سے کم پانچ ہزار خریدار ہوں۔ پانچ ہزار خریداروں کی تعداد اردو کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔

اگلے ہفتے سے ہماری زبان میں ایک صفحہ مہینے میں دو بار ایڈیٹر کا صفحہ ہوگا جس میں ایڈیٹر کے نام آئے ہوئے خطوط کے جوابات، خاص خاص ادبی کارناموں، اہم کتابوں، قابل ذکر مضامین کی طرف اشارے ہوں گے انداز بیان شخصی اور بے تکلف ہوگا۔

رفتار کا سلسلہ پھر سے شروع کیا جائے گا جس میں ایک ممتاز ادیب، ادبی مسائل پر اپنے تاثرات پیش کریں گے۔ ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری زبان کے ہر شمارے میں نظمیں یا غزلیں دینے کی ضرورت نہیں، ہر شمارے میں ایک نظم یا غزل دی جائے گی۔

مکتوب لندن کے علاوہ ہم مکتوب شکاگو اور مکتوب ماسکو بھی جلد شروع کرنے والے ہیں۔

اگر ان سب اضافوں کے بعد ہماری زبان کا چندہ بجائے چار روپے سالانہ کے پانچ روپے کر دیا جائے تو ہمارے پڑھنے والوں کو ناگوار تو نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم پڑھنے والوں کے رد عمل کے منتظر رہیں گے۔

اردو ادب کے تازہ شمارے سے آپ ایک خوشگوار تبدیلی دیکھیں گے۔ اردو ادب کے تحقیقی و تنقیدی معیار اور میلان کو برقرار رکھتے ہوئے ہم اب ہر شمارے میں تخلیقی ادب کے نمونے بھی شامل کرتے رہیں گے اس کا مقصد یہ نہیں کہ اردو ادب کی خشکی کو دور کرنے کے لیے اس میں کچھ تر مال بھی شامل کر دیا جائے۔

بلکہ ہم خاصے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تحقیق و تنقید کو تخلیق سے بالکل علیحدہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ تحقیق و تنقید کے ساتھ تخلیقی ادب کے اچھے نمونے بھی ہونے چاہئیں اور اس سلسلے میں نئے اور پرانے عام لکھنے والوں کی تخلیقات کے لیے اردو ادب کے صفحات کھلے ہوئے ہونے چاہئیں۔ اس اقدام کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ اردو ادب کو تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کے ذوق کی تربیت کرنی چاہیے اور اس تربیت کے لیے تحقیق و تنقید کی روشنی کے ساتھ تخلیقی ادب کی ترویج بھی ضروری ہے۔

آگرہ میں اردو کالج کا قیام

جامعہ اردو علی گڑھ کی خالق، بزم اقبال آگرہ نے اپنے ایک جلسہ میں اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اردو کالج کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جلسہ حضرت تابش اکبرآبادی کی صدارت میں بتاریخ ۹ر نومبر ۶۷ء سیوہ کٹرہ آگرہ میں منعقد ہوا تھا۔ کالج کے فوری انتظام اور ضروری امور کے لیے جناب معین زریا کا انتخاب بحیثیت ناظم اعلیٰ ہوا۔ کالج کے آئین و نصاب کے لیے مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی۔

پروفیسر معظم علی شاہ، پروفیسر گوپال کرشن کھیچو، جناب یوسف مرزا انجینئر، جناب معین زیدی، جناب اسرار اکبرآبادی، جناب سید عبدالعزیز، جناب محمود اللہ خاں۔

اس کالج میں جامعہ اردو علی گڑھ کے نصاب کی تعلیم کے علاوہ ان لوگوں کے لیے جنکی مادری زبان اردو نہیں ہے "اردو قابلیت" کے سرٹیفکیٹ اور "اردو اعلیٰ قابلیت" کی سند کے نصاب کی بھی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ اس نصاب کو اردو کالج آگرہ ہی مرتب کرے گا۔ (یوسف مرزا سکریٹری)

لکشمی بائی گرلز کالج بھوپال میں اردو میں ایم۔اے۔ کھل گیا

بھوپال۔ لکشمی بائی گرلز کالج بھوپال میں اس سال جہاں معاشیات اور سیاسیات میں پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کھولے گئے ہیں وہاں اردو میں بھی ایم۔اے کھل گیا ہے۔ یہ وکرم یونی ورسٹی کا تیسرا کالج ہے جہاں ایم۔اے تک اردو تعلیم کا بندوبست ہے حمیدیہ کالج بھوپال اور مادھو کالج اجین میں بھی ایم۔اے اردو کلاسیز ہیں۔ مدھیہ پردیش میں یہ واحد گرلز کالج ہے جہاں اردو کو یہ مقام ملا ہے خوشی کی بات ہے کہ ۱۲ طالبات نے پہلے ہی سال داخلہ لیا ہے۔ یہ تعداد دوسرے مضامین کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں پروفیسر مس شفیقہ فرحت اور پروفیسر آفاق احمد (جن کا گورنمنٹ کالج سیہور سے حال ہی میں یہاں تبادلہ ہوا ہے) اس شعبہ کے اساتذہ میں شامل ہیں۔
(نامہ نگار)

مجلس ترقی ادب کو عطیہ

مجلس ترقی ادب لاہور نے اردو ادب کی ترویج و ترقی میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور خاص طور سے کلاسیکی ادب کی اشاعت نو اور اردو زبان و ادب پر علمی تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں جس غیر معمولی دلچسپی اور اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت دیا ہے اس کے اعتراف میں حبیب بنک نے پچاس ہزار روپے کا عطیہ مجلس کو پیش کیا ہے۔

(گوہر نوشاہی۔ مجلس ترقی ادب لاہور)

ماہنامہ سہیل گیا کا خصوصی نمبر

ادبی حلقوں میں یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ ماہنامہ سہیل گیا اپنا ایک خصوصی نمبر بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر کے نام سے نکال رہا ہے جس میں شہر بھاگلپور کی ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کے موجودہ ادباء و شعراء کی شخصیت و فن پر مضامین ہوں گے۔ اس نمبر کے لکھنے والوں میں ہند و پاک کے ممتاز اہل قلم شامل ہیں۔

مزید تفصیلات کے لیے اراکین مجلس اشاعت بھاگلپور سے خط و کتابت کی جائے۔

ہندی اسٹیج کی سو سالہ تقریب

وارانسی۔ جدید ہندی اسٹیج کی سو سالہ تقریب ملک بھر میں کاشی ناگری پرچارنی سبھا کی طرف سے اگلے سال منائی جائے گی یہ تقریب ایک ہفتہ رہے گی اس کے دوران تمام علاقائی زبانوں میں ڈرامے کئے جائیں گے۔ اور اسٹیج کے مختلف پہلوؤں پر مباحثے ہوں گے۔ جدید اسٹیج کا پہلا ہندی ناٹک ۱۸۶۸ء کے دوران کلکتہ میں کھیلا گیا تھا۔ اس کا نام تھا "جانکی منگل" یہ تلسی داس کے رام چرت مانس پر مبنی تھا اس میں جدید ہندی ناٹک کے سرتاج بھارتیندو ہرش چندر نے ایک اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ (الجمعیۃ)

ایشیا کے لیے کتابیں مہم کو کامیابی

نیویارک۔ ایشیا کے لیے کتابیں فراہم کرنے کی مہم کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ ۲۵ لاکھ سے زیادہ کتابیں اور رسالے جمع ہو چکے ہیں یہ کتابیں اور رسالے ۵۰۰ کالجوں کے طلبہ، ناشروں، کتب فروشوں، شہری اداروں، لائبریریوں اور عام شہریوں نے دی ہیں۔ اس کے علاوہ نقد رقوم بھی ملی ہیں، جن سے ۱۰ لاکھ کتابیں فراہم کی جا سکیں گی۔ اس اسکیم سے آٹھ ممالک فائدہ اٹھا رہے ہیں، فلپائن، جاپان، ہندوستان، ملیشیا، سنگاپور، ویت نام اور سیلون۔ (الجمعیۃ)

کوکب قدر سجاد علی مرزا

بیگمات اودھ کے خطوط کا تاریخی پس منظر

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۶) نادم صاحب کے نزدیک بیگمات کے خط واجد علی شاہ کے خطوں سے زیادہ نایاب ہیں:

"جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اب تک جو منثور اور منظوم مجموعہ مکاتیب دستیاب ہوئے ہیں ان میں جان عالم کے خطوط زیادہ ہیں اور بیگمات کے نسبتاً کم۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ۱۸۵۶ء میں جب لکھنؤ پر تباہی آئی اور محلات شاہی قیصر باغ کے حدود سے دربدر کی گئیں تو ان کے املاک اور اسباب کی تباہی میں یہ نوادر بھی کباڑ تک پہنچ گئے ....." ۔ نقوش، ایضاً صفحہ

رقعات بیگمات، بیگمات اودھ کے خطوط اور تاریخ نو ادر کے سلسلے میں نادم صاحب سے جیسی سامنے کی غلطیاں ہوئی ہیں، شبہ میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہیں کہ کیا نادم صاحب واقعی ان مجموعوں تک رسائی حاصل کر سکے ہیں۔ لیکن خیر! اس نکتے کی وضاحت کے سلسلے میں ابھی کچھ اور کہنا ہے۔ پہلا غور طلب امر یہ کہ بیگمات کے خطوں کی نایابی سے سنہ ۵۶ء کی تباہی کو کیا نسبت؟ تباہی آئی لکھنؤ میں اور خط اگر کباڑ پہنچے تو واجد علی شاہ کے جو کلکتے سے لکھنؤ آئے تھے نہ کہ بیگمات کے جو لکھنؤ سے کلکتے بھیجے گئے تھے، یا پھر نادم صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سنہ ۵۷ء کے لٹیروں کے ہاتھوں واجد علی شاہ کا اندوختہ بھی لکھنؤ آگیا۔ دوسرے نادم صاحب نے خطوط نویسی کی مدت سنہ ۱۸۵۶ء سے سنہ ۱۸۸۷ء تک بتائی ہے۔ لکھنؤ پر تباہی کے تین دور گئے: سنہ ۱۸۵۶ء میں اخراج سلطنت، سنہ ۱۸۵۷ء میں بغاوت اور سنہ ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوج کے ہاتھوں لوٹ مار۔ خط اگر تلف بھی ہوئے تو شروع کے چند سالوں کے لیکن عجیب لطف یہ کہ بیگمات کے جتنے خط مجھے یا نادم صاحب کو دستیاب ہوئے سب بصورت مجموعہ اسی دور کے ہیں۔ اس زمانے کا ایک خط نہیں ملتا جس زمانے میں بقول نادم صاحب بیگمات واجد علی شاہ کی اکثریت لکھنؤ میں قیام پذیر تھی اور قدیم فن انشاپردازی کا احیا ہو رہا تھا۔ نادم صاحب نے قیاس کی گہرائیوں سے صرف ایک وجہ نکالی اور اس میں بھی اتنے جھول!

(۷) نادم صاحب نے چار مجموعوں سے ذاتی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ ان چار مجموعوں سے اگر خطوں کی تعداد کا حساب کیجیے تو (۱) تاریخ نو ادر (مطبوعہ) میں بیس خط سب واجد علی شاہ کے ہیں، (۲) رقعات بدر کے چونتیس خطوں میں کوئی خط واجد علی شاہ کا نہیں ہے، (۳) رقعات بیگمات میں اکہتر خط بیگمات اور بتیس واجد علی شاہ کے ہیں، (۴) بیگمات اودھ کے خطوط کے اکاسی خطوں میں اگر وہ خط بھی جانے کے مستحق ہیں تو صرف چند واجد علی شاہ کے ہیں۔ ان چاروں مجموعوں کے پیش نظر نادم صاحب واجد علی شاہ کے ۵۵ اور بیگمات کے ۱۶۱ خطوں سے واقف ہیں اور اس واضح حقیقت کے باوجود وہ امید رکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے خطوں کو زیادہ اور بیگمات کے خطوں کو نسبتاً کم خیال کیا جائے گا۔ نادم صاحب ان مجموعوں تک نہیں پہنچ سکے اگر ان تک بھی ان کی رسائی ہو جائے تو جو اصل حقیقت ہے اس میں سر مو فرق نہ ہوگا۔ بیگمات کے خطوں کی تعداد واجد علی شاہ کے خطوں سے زیادہ ہے۔ تعجب ہے کہ اکیلے واجد علی شاہ کے مقابلے میں بیگمات کے نامہ نویسوں کی فوج اور بقول نادم صاحب پانچ قسم کے لکھنے والے خط لکھیں، واجد علی شاہ بے غرض اور لکھنے والے غرض مند ہوں، لکھنؤ کی تباہی میں واجد علی شاہ کے خط خاص طور پر تلف ہوں اور نادم صاحب کا قیاس رہنمائی نہ کرے کہ کس کے خط زیادہ اور کس کے کم ہو سکتے ہیں۔

(۸) ناانصافی ہوگی اگر نادم صاحب کی صفائی میں اتنا اور نہ کہا جائے کہ انھوں نے مجموعوں کو شمار نہیں کیا ہے مندرجہ بالا اقتباس میں صرف "مجموعہ مکاتیب" لکھا ہے اور مضمون کے آخر میں مزید توضیح کی ہے:

"بیگمات اودھ کے منظوم خطوط کے جو مجموعے اس وقت تک مجھے مل سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں:
(۱) رقعات بدر ..... (۲) بیگمات اودھ کے خطوط ..... (۳) رقعات بیگم ....." نقوش، ایضاً صفحہ ۱۰۸

نادم صاحب کے اس محتاط بیان سے معلوم ہوا کہ بیگمات اودھ کے خطوط کے قلمی مجموعے اور واجد علی شاہ کے مطبوعہ اور قلمی دونوں مجموعے اس بیان سے خارج ہیں۔ ممکن ہے ایسے چند مجموعے موصوف کے علم میں ہوں اور وہ آئندہ اس بیان کو مکمل کر دیں لیکن بات جب اتنی احتیاط کے ساتھ قلم بند ہو رہی ہے تو احتیاطاً میں اتنا اور عرض کر دوں: نادم صاحب نے جن تین مجموعوں کو بیگمات کے خطوں کا مجموعہ کہا ہے ان میں سے کوئی مجموعہ تو کیا کسی مجموعے کا ایک خط بھی کسی بیگم کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ دلیل:

(الف) رقعات بدر واجد علی شاہ کے مرتب کیے ہوئے اور شاہی کتب خانے کے مہر شدہ قلمی نسخے تاریخ بدر مملوکہ ادارہ ادبیات اردو (حیدر آباد، دکن) کی مسخ کی ہوئی نقل ہے۔ اس کے مؤلف حکیم محمد علی عرش ملیح آبادی نے شائع کرتے وقت علاوہ دوسری تبدیلیوں کے جو بیدردی سے قلمی نسخے پر کی گئی ہیں ان عبارتوں کو حذف کر دیا ہے:

(۱) "(نامۂ محبت شمامہ .... تمہارا وصول ہوا) ..... حرف حرف پڑھو اگر ہم نے نا تاریخ بدر صفحہ ۲"

(۲) یہ بھی اپنے ہاتھ کا کام نہیں، کاتب کو اختیار ہے جو چاہے لکھ دے یہ مفتوح ناچار ہے۔" تاریخ بدر صفحہ

نادم صاحب چاہیں تو حقیقت کو دیدہ و دانستہ مسخ کرنے والوں میں حکیم صاحب کا نام بڑی خوشی سے لکھ سکتے ہیں۔

(ب) "بیگمات اودھ کے خطوط" کے بارے میں میں نے اسی ہماری زبان کے ایک گزشتہ شمارے میں وعدہ کیا تھا کہ تحریف اضافہ رد و بدل ایسی کوئی علت نہیں جس کی مثال اس مجموعے کے خطوں سے پیش نہ کی جا سکتی ہو اور مناسب وقت اور موقع پر ایسا ہی کیا جائے گا۔ وہ مناسب وقت اور موقع خوبیٔ قسمت سے ابھی تک نہیں آیا۔ مضمون کے لیے ممکن نہیں کہ مقالے کی تمام صفائی کرے، اور بحث کا تقاضہ ہے کہ ایسا ضرور کیا جائے۔ فرداً فرداً ہر خط کے بجائے ایک خط کا جس جو واجد علی شاہ کی طرف سے لکھا گیا تھا، اسی وقت واضح کیا جا چکا تھا۔ چند اور خطوں کا حال اب درج کیا جاتا ہے۔ بدر عالم صاحب جن کے بارے میں آپ سن چکے کہ لکھنا پڑھنا کچھ نہ جانتی تھیں، ان کی طرف سے خط مندرجہ صفحہ ۲۲-۲۳ میں لکھا جاتا ہے:

"دل کو شعر گوئی میں لگا لیا ہے، اپنے کو مجنون صفت بنا لیا ہے"

جس خط سے یہ اقتباس پیش کیا گیا تمام کا تمام موضوع ہے اور بدر عالم کے اس خط کے علاوہ جو آٹھ خط اس مجموعے میں ہیں، رقعات بدر کی اور بھی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔ واجد علی شاہ کی طرف سے بدر عالم کے نام صرف تین خط مفتی انتظام اللہ شہابی کے مجموعے میں ملتے ہیں اور یہ تینوں موضوع ہیں: (۱) خط مندرجہ صفحہ ۱۰۲ میں القاب اور میر کے اشعار سے قطع نظر ایسی کوئی بات نہیں جو خط میں ہو اور بادشاہ کے عشق نامہ کی داستان ۷۵ میں نہ ہو، (۲) منظوم خط مندرجہ صفحہ ۱۰۷ میں دستخط اور القاب نثر میں ہیں اور منظوم حصہ اور غزل بادشاہ کی مثنوی دریائے تعشق (صفحہ ۸۰ اور صفحہ ۲۴۱) سے اٹھائی گئی ہے (۳) اسی دریائے تعشق (صفحہ ۲۰۳-۲۰۵) کی ایک اور غزل تیسرے خط مندرجہ صفحہ ۸۸-۸۹ کے کام آئی ہے۔ خطوط مسخ کرنے والے نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ واجد علی شاہ ایک سی بات دو جگہ نہیں لکھتے اور دوسروں کے اشعار سے اپنی نثر کو مرصع کرنا ان کے مزاج اور اسلوب سے منافرت رکھتا ہے۔ نادم صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ

"فنی حیثیت سے دوسرے لوگ بھی جان عالم کے نام خطوط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتے تھے"

نقوش: ایضاً صفحہ ۱۰۳

بے جا نہ ہوگا اگر نادم صاحب مفتی انتظام اللہ شہابی کا نام ان فنکاروں میں لکھ لیں جو موجودہ زمانے میں فنی حیثیت سے خطوط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور اس مبہم فن انشا پردازی کا احیا کرنے لگے جس میں بقول نادم صاحب "ایک مخصوص عصری ارتقا کی جھلک نظر آتی ہے"۔ حزن اختری کو حزن اختر اور عشق نامہ کو پری خانہ کہنا اسی عصری ارتقا کی جھلکیاں ہیں جن کی طرف ہماری زبان

کے مذکورہ بالا شمارے میں اشارہ کیا گیا تھا اور صاحبان نظر چاہیں تو ذرا سی جستجو سے اس مجموعے میں ایسی جھلکیاں اور بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ مفتی صاحب کا مجموعہ چالیس پینتالیس فی صدی رقعات بیگمات، رقعات بدر اور چند اور مطبوعہ خطوں کی فنکارانہ نقل ہے اور باقی حصے کے وجود پر مفتی صاحب نے کتاب کے دیباچہ اور حاشیوں میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اتنی بے راہ روی کے بعد جب تک اس "نجی مجموعے" کے کاتب کا نام نہ معلوم ہو، نہ اس مجموعے کا کوئی خط، وہ خواہ نواب بادشاہ محل عالم ہی کے نام سے کیوں نہ ہو، مستحق شہادت کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی مرتب کو ان غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے الزام سے بری کرنا ممکن ہے۔

(ج) رقعات بیگمات نامی مجموعہ خطوں کی ایک بالکل ہی ہیولیٰ ذہنیت کا حامل ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں کے وقت سے جن کو عوام اودھ کی تاریخ پر سند جانتے ہیں شیخ تصدق حسین کے وقت تک جو نادم صاحب کی نظر میں اودھ کی تاریخ پر عبور رکھتے ہیں پچاس برس کے عرصے میں نہ معلوم کتنے افراد نے اسے دیکھا اور اس کے خطوں پر تبصرہ فرمایا۔ بجائے اس کے کہ میں اس مجموعے کے خطوں پر اپنے خیالات کا اظہار کروں اور مضمون میں ایک مضمون اور شامل ہو جائے، میں اسے بہتر سمجھتا ہوں کہ اتنی معلومات حاصل ہو جانے کے بعد کوئی دوسرے صاحب اس کی اصل حقیقت بیان کر دیں۔ تحقیق کے اصولوں پر چلتے ہوئے اگر انھوں نے وہی نتیجہ اخذ کیا جس کا اہل علم کی مذکورہ بالا نشست میں اظہار کیا جا چکا ہے تو مجھے خوشی ہوگی کہ میرے بیان کی تائید ہو گئی، اور اگر ان کا نتیجہ میرے نتیجے سے مختلف اور استدلال مستحکم ہوا تو میرے بیان کی تصحیح ہو جائے گی۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

جب نادم صاحب جیسے کہنہ مشق صحافی کی نظر میں:

"بیگمات کے لکھے ہوئے رقعات اور ایسے خطوط میں جو ان کے حکم سے ان کے ملازمین نے لکھے ہیں کوئی امتیاز کرنا سخت دشوار ہے"

(نقوش: ایضاً صفحہ ۱۰۲)

تو پھر وہ اپنے ان قارئین سے جو تجسس اور تفحص کا اتنا بھی ذوق نہیں رکھتے کب امید کر سکتے ہیں کہ وہ اس دشواری کا کوئی حل نکال سکیں گے۔ اب تک کم سے کم بیانات میں یکسانیت تھی، خیالات میں یکسوئی تھی، ہر خط عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب ہر خط شک کی نظر سے دیکھا جائے گا اور کسی ایک خط کے بارے میں یقین کے ساتھ نہ کہا جا سکے گا کہ وہ کسی بیگم یا کسی نامہ نویس کا لکھا ہوا ہے۔ نادم صاحب کے مضمون کا اگر یہی حاصل ہے اور سوا اس کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے جب کہ تینوں مجموعے سب نامہ نویسوں کے لکھے ہوئے تھے اور وہ ان میں امتیاز کرنا سخت دشوار سمجھتے رہے تو ان کا یہ بیان[1]

(باقی صفحہ ۷ پر)

[1] نقوش ۱۹۶۶ء

غزلیں

منشاء الرحمٰن خاں منشاء

اسیرِ حسن پُرفن بن گئی ہے — نظر خود اپنی دشمن بن گئی ہے
بسا اوقات اُن قدموں کی آہٹ — دلِ مضطر کی دھڑکن بن گئی ہے
محبت کی اک ہلکی سی خلش ہی — نشاطِ غم کا مخزن بن گئی ہے
صدا دل سے اٹھی تھی راگنی کی — لبوں تک آ کے شیون بن گئی ہے
کبھی جو زندگی تھی شیشہ و گل — وہی اب سنگ و آہن بن گئی ہے
بہارِ چمن والوں کے حق میں — بلائے جیب و دامن بن گئی ہے
بالآخر، آخرِ شب کی سیاہی — دلیلِ صبح روشن بن گئی ہے
مہ و انجم کی دور افتادہ دنیا — اب انساں کا گھر آنگن بن گئی ہے

بفیضِ ندرت و ایجازِ منشاء
غزل سرمایۂ فن بن گئی ہے

ایم کوٹھیاوی راہی

وہ چہرے مٹ گئے تو کیا ہیں ذہن سے یکدم
تمام شب جو کبھی مجھ کو یاد آتے تھے
خوشی کے دیپ جلے درد کی فصیلوں پر
وہ لمحے بجھ گئے آخر جو خوں رلاتے تھے
پکارتی ہیں سرِ شب سمندروں کی تہیں
وہ رات کیا ہوئی جب ہم بھی ڈوب جاتے تھے
وہ ٹھنڈکیں کہ چٹانیں بھی تھرتھراتی تھیں
مگر ہم ایسے میں جشنِ خزاں مناتے تھے
پڑھے بغیر جلا دی گئی ہماری کتاب
کہ جس کو لکھنے میں ہم اپنا خوں جلاتے تھے
کہو تو پھر بھی رگوں میں لے چلوں راہی
کہ جن کے جسم محبت کے گیت گاتے تھے

آزاد گلاٹی

دیکھا تھا اپنے سر پہ جو پہلا سفید بال
تڑپا گیا تھا دل کو تری عمر کا خیال
پہنچے تھے ان کے پاس، مگر اُن کا جواب لائیں
آنکھوں میں ہی لرزتے رہے اَن گنت سوال
وہ مل گئے ہیں آج تو اے دل کی کشمکش
جو کام آج کا ہے، نہ تو اس کو کل پہ ڈال
اشکوں سے راحتِ غمِ الفت کشید کر
آہوں سے اب سلگتی ہوئی آگ کو نکال
آزاد اپنے چہرے کو دیکھا تو ڈر گئے
پڑنے لگا تھا اس پہ بھی اٹھتے سمے کا جال

برٹش میوزیم

برٹش میوزیم لائبریری دنیا کی سب سے بڑی تین لائبریریوں میں سے ایک ہے دوسری دو لائبریریاں پیرس اور واشنگٹن میں ہیں برطانوی لائبریری کا مستقبل کچھ غیر یقینی سا معلوم ہوتا ہے ۲۰ سال کی بحث و تمحیص کے بعد حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس لائبریری کی عمارت میں توسیع نہ کی جائے گی۔ ۱۰۰ سال سے طلبا اور محققوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس قومی لائبریری کے لیے ایک بہت بڑی عمارت کی ضرورت ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ یہ عمارت کہاں تعمیر کی جائے گی۔ برطانیہ کی میوزیم لائبریری استدادِ زمانہ کا شکار رہی ہے۔ یہ لائبریری کتابوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے اور اس کے اسٹور روموں میں کتابوں کے اتنے انبار لگے ہوئے ہیں کہ ان میں چلنا پھرنا مشکل ہے آئندہ حالت اور تشویشناک ہو سکتی ہے کیونکہ کاپی رائٹ کے قانون کے ماتحت اس لائبریری کو ہر نو چھپنے والی کتاب اخبار اور رسالہ کی ایک جلد مفت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے یعنی اس لائبریری کو ہر سال ۰۰ ہزار جلدیں وصول ہوتی ہیں۔ صرف مطبوعہ کتابوں کی اتنی کثرت ہے کہ اگر ان الماریوں کو ایک کے پیچھے ایک رکھ دیا جائے تو وہ ۲۰۰ میل تک پہنچ جائیں گی۔ چند سال قبل اس کے رسالوں اور اخبارات کو لندن سے باہر منتقل کر دیا گیا کیونکہ لائبریری کی عمارت میں ان کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ عملہ پر کام کا دباؤ اتنا پڑتا ہے کہ پورے ایک سال پہلے سے نئی فہرستیں تیار کرنی پڑتی ہیں۔ عملہ کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔

اس وقت برطانیہ کی نجی لائبریریاں ہیں۔ مگر میوزیم لائبریری سب سے زیادہ قدیم ہے اور ہر لحاظ سے ایک قومی لائبریری ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوران اس لائبریری کے لیے کتابیں عطیات کے طور پر حاصل کی گئیں، یا خریدی گئیں ۱۷۵۳ء میں سر ہانس سلون کی فراہم کردہ کتابیں اس کے پوتے نے عطیات کے طور پر دیں۔ ۱۷۵۳ء میں ارل آف آکسفورڈ کی جمع کی ہوئی کتابیں دس ہزار پونڈ کے معاوضہ میں حاصل کی گئیں جن کی قیمت اب کروڑوں پونڈ ہے۔ اس لائبریری کی موجودہ عمارت گذشتہ صدی کے دوران ماہر تعمیرات سمرک کی نگرانی میں تعمیر ہوئی۔ یہ لائبریری تحقیق کے کام کے لیے انتہائی مفید ہے اور صرف ان لوگوں کو کتابیں دی جاتی ہیں جن کے پاس لائبریری کے ٹکٹ ہیں۔ اس کا مطالعہ کا کمرہ اتنا بڑا ہے کہ دنیا کی کسی اور لائبریری کا نہیں ہے مگر اس کے باوجود اس میں بیٹھنے کے لیے جگہ بہت مشکل سے ملتی ہے۔ مطالعہ کا یہ کمرہ ایک طالب علم پنیزی کی یادگار ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں لائبریرین تھا اس کی درخواست پر حکومت نے مالی مدد دی اور یہ دارالمطالعہ تعمیر ہوا۔ اسی دارالمطالعہ میں کارل مارکس نے ریسرچ کا کام کیا اور اپنی مشہور کتاب "ڈس کیپیٹل" تصنیف کی ہے اسی جگہ مہاتما گاندھی، مسٹر جناح اور پنڈت نہرو نے مطالعہ کیا۔ یہ لائبریری برطانیہ کی ایک گراں قدر متاع اور اطلاعات کا مخزن تصور ہوتی ہے۔

- - - - - -*** - - - - - -

صفحہ ۴ سے آگے

"یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ بیگمات اودھ کے جو خطوط اب تک سامنے آئے ہیں سب ان منشیوں، مصدیوں اور دیوانوں کے لکھے ہوئے ہیں لیکن قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے خطوط کی ہے جو ان بیگمات کے حکم سے دوسرے قلم کاروں نے آراستہ و پیراستہ اسلوب نگارش میں سجا کر پیش کیے تھے اور ان میں ایک نقطہ بھی خود اس بیگم کا لکھا ہوا نہیں ہے جس کے نام سے یہ لکھے گئے ہیں۔"

(نقوش، ایضاً ص ۱۰۳)

محض الفاظ کا گورکھ دھندا بن جاتا ہے جس میں بظاہر سب کچھ ہے اور درحقیقت کچھ بھی نہیں۔ ناظم صاحب کی دشواری کالج و یونی ورسٹی کے ان طلبہ کی دشواری کے مثل ہے جو پڑھنے لکھنے سے جی چرائیں اور امتحان کے موقع پر سوال کو اسٹف (STIFF) فرماتے ہوئے جواب لکھنے کی بے سود کوشش کریں۔ ناظم صاحب کے نزدیک جو کہنا صحیح نہ تھا کہنے والے نے اعتماد کے ساتھ وہی بات کہی اور اس کی خبر عام ہونے پر کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔

امید کہ ناظم صاحب کی نظر میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر اور انجمن ترقی اردو کے ہفت روزہ "ہماری زبان" کے پڑھنے والے معقول اور نامعقول بیان میں تمیز کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہوں گے۔ ناظم صاحب اگر "ایسا کہنا صحیح نہ ہوگا" کا کوئی سبب بتا دیتے تو کوشش کی جاتی کہ ان کے اطمینان کی کوئی صورت نکالی جائے لیکن اب بھی کیا گیا ہے۔ ناظم صاحب یا کوئی صاحب "جو خطوط سامنے آئے ہیں" میں سے کوئی خط اب پیش کر دیں۔ ممکن ہے ان اسناد اور دلائل کے علاوہ جن کا ذکر ہوا کوئی نئی بات یا اس نامہ نویس کا نام پیش کیا جا سکے جس نے وہ خط لکھا ہو۔ ناظم صاحب نے "خطوط سامنے آئے ہیں" لکھ کر کئی پہلو بچا لیے ہیں لیکن اس پرخلوص درخواست کا مقصد چونکہ معلومات میں اضافہ کرنا اور اپنے مقالے کو اس کی پیش کردہ صورت سے زیادہ جامع بنانا ہے اس لیے قارئین کرام سے دست بستہ گزارش ہے اس بیان کو خودستائی پر محمول نہ کیا جائے۔

(تمام شد)

مراسلہ

بمبئی کا مجوزہ اردو کنونشن اور سردار جعفری

"ہماری زبان" شمارہ ۴۴ ۱۵ر نومبر ۱۹۶۷ء کے مراسلات کے کالم میں جناب علی سردار جعفری کا ایک مراسلہ شایع ہوا ہے اس میں انھوں نے اپنے مراسلے مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے اسی جملے کی تشریح فرمائی ہے جسے اس شمارے کے اداریے میں" وضاحت طلب کہا گیا ہے" زیر نظر مراسلے میں جعفری نے اس وضاحت طلبی پر اپنے خیالات کا کھل کر اظہار فرمایا ہے اور اس طرح انھوں نے اس بحث کو ختم کر دیا ہے جو اردو کے مخلصین کے دو بڑے حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا کر سکتے تھے۔

سردار جعفری نے اپنے جملے کو صاف صاف وضاحت اور تشریح کرکے وہ راہ ہموار کر دی ہے جو مجوزہ کنونشن کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے لیکن اس مراسلے میں جعفری کچھ پتے کی ایسی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جن پر اہل نظر اور ہمدردانِ اردو کو کنونشن میں شرکت سے پہلے خوب اچھی طرح سے غور کر لینا چاہیے۔

جعفری نے لکھا ہے:۔

"اردو کے مسئلے پر اس وقت بمبئی کے احباب کچھ اس طرح سوچ رہے ہیں کہ بیس سال کے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ محض عرضداشتوں اور درخواستوں سے کام نہیں چل سکتا۔ قربانیوں اور عوامی تحریکوں اور قانون شکنی کا نعرہ بھی ملک کے مخصوص حالات میں اپنے دور رس نتائج میں قابلِ غور ہے کیا ہم اردو کے نام پر لکھنؤ یا دہلی میں ایک دن کی ہڑتال کرا سکتے ہیں؟ کیا ہم ایک گھنٹے کے لیے بھی امین آباد چوک بازار بند کرا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے اگر صورتِ حال یہ ہے تو ہمیں کوئی اور ہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس کے بعد جعفری نے اگلے اقدام کی طرف جو اشارے کیے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) ہم اردو کی حمایت میں غیر اردو حلقوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کریں۔

(۲) ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے ساتھ لیں اس میں خاص طور سے ہندی ادیبوں کا تعاون بہت اہم ہے

(۳) ہم سیاسی جماعتوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے نہ کانگریس کو نہ مخالف جماعتوں کو۔

(۴) ایک ایسا وقت آ سکتا ہے جب صرف اردو والوں کے بجائے ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیب اور دانشور مل کر سیاسی جماعتوں پر زور ڈال سکتے ہیں۔

(۵) لیکن اس وقت کو لانے کے لیے اردو والوں کو متحد ہو کر کوشش کرنی پڑے گی ملک کے نئے حالات کے پس منظر میں اپنے مطالبات اور پچھلے کاموں کا جائزہ لے کر از سرِ نو مطالبات مرتب کرنا پڑے گا۔

آخر میں جعفری نے تمام زبانوں کے ادیبوں کو کنونشن میں شرکت کی دعوت دینے سے پہلے جو پیراگراف لکھا ہے اس کا یہ جملہ میرے اس مضمون کا موضوع بحث ہے کہ:۔

"اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ حکومتوں کے تعاون کے بغیر ہم خود اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے لیے کیا کر سکتے ہیں:

آزادی کے بیس سال کے بعد ہی اردو کی بقا و ترقی کا مسئلہ اتنا جلیبٹ نہیں ہوا ہے جتنا کہ اسے آج محسوس کیا جا رہا ہے۔ بیس سال پہلے بھی اردو والے اردو کی بقا و ترقی کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور انھیں کم و بیش انہی مشکلات سے گزرنا پڑا ہے جن کا آج سامنا ہے فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ اردو آج کسی صوبہ یا علاقہ کی سرکاری، علاقائی یا ثانوی زبان نہیں رہی ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کا جنم اور حیات اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ کل بھی اردو کے لیے بہت کچھ کام کیا گیا اور آج بھی تھوڑا بہت کیا جا رہا ہے لیکن اس کے کل اور آج میں جو فرق نمایاں ہے وہ لائحہ عمل اور ایثار پسندی کا ہے۔

آزادی کے بیس سال پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) کے علاوہ بھی بہت سی انجمنیں تھیں جو اردو کی ترقی و بقا کا کام کرتی تھیں ان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نقطۂ نگاہ کا فرق جو آزادی کے بیس سال بعد نمایاں سے نمایاں تر ہوا اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ کم از کم اردو کی بقا کی جدوجہد میں سب کا نظریہ مشترک تھا۔ آزادی کے بعد اردو کے ادیب اور دانشور دو الگ خانوں میں بٹ گئے اس طرح وہ شیرازہ بکھر گیا جو اردو کی بقا کی ضمانت تھا۔

آزادی کے بعد اردو کے ادبی رسائل میں جتنی اختلافی بحثیں ہوئیں اتنی تعمیری نہیں ہوئیں اور کہیں کوئی تعمیری قدم

اٹھایا گیا تو اردو کی خیر خواہی کے نعرہ بازوں نے ہی اس میں دراڑیں ڈال دیں یہاں اردو والوں نے شخصیتیں دیکھیں مقصد اور کچھ نہیں دیکھا اردو آج جتنی غیر اردو والوں میں مقبول ہے (بلکہ ان کی روحانی غذا بن گئی ہے) اس سے پہلے کبھی نہیں تھی اس کا ثبوت ہندی، مرہٹی، بنگالی اور کنڑی ادب کے ادبی اور افسانوی رسالوں اور انجمنوں سے فراہم کیا جاسکتا ہے جن کا کوئی شمارہ اردو کے ترجموں سے خالی نہیں ہوتا۔

اردو زبان میں بنے والی فلموں کا اردو کی مقبولیت میں سب سے بڑا ہاتھ ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ "بمبئی کے احباب" اردو زبان میں بنے والی فلموں کو اردو کا سرٹیفکیٹ نہیں دلواسکے۔

غیر اردو کے ادیب اور شاعر فرقہ پرست شدھ ہندی کے لیکھکوں کے پرچار کے باوجود اپنے مضامین اور کہانیوں میں اردو کے الفاظ ہی نہیں اشعار بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں پاکٹ بک سیریز کی کتابیں اس کی زندہ ثبوت ہیں۔

اردو کا جتنا لٹریچر آج دیوناگری رسم خط میں منتقل ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اتنا آزادی سے پہلے جب اردو کی مخالفت اس شدت سے نہیں تھی نہیں ہوا تھا ہندی کے ادبی حلقوں میں اردو کی مقبولیت کا کیا یہ کم ثبوت ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں چھپنے والے ہندی ہفت روزہ "دھرم یگ" اور "ہندوستان" کرشن چندر اور راہی معصوم رضا سے مستقل مضامین لکھواتے ہیں کیا آزادی سے پہلے اردو کے کسی ادیب کو ہندی والے پوچھتے تھے؟

میری طرح سردار جعفری اور کرشن چندر کے حلقۂ احباب میں بھی ایسے کتنے غیر اردو وال (ہندی، مرہٹی، بنگلہ اور کنڑی جاننے والے) ہوں گے جو دل سے خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں اردو زبان فارسی رسم خط میں پڑھائی جائے۔ لیکن ان کی اس خواہش کو نہ میں پورا کرسکا ہوں نہ سردار جعفری اور نہ کرشن چندر اس کی کوئی سبیل تلاش کرسکے ہیں۔

اردو کے ان گنت مقبول اور مشہور لیکھک آج اپنے لیکھ اور کہانیاں دیوناگری میں کھپانے کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے کہ ہندوستان میں اردو کا کوئی رسالہ ان کو وہ معاوضہ ادا نہیں کرسکتا جو ہندی کے رسائل پیشگی ادا کرتے ہیں اس لیے کہ اردو کے کسی ادبی رسالے کی تعداد اشاعت دو ہزار سے زیادہ نہیں ہے رسائل کی آمدنی کا ذریعہ خریدار نہیں بڑے اشتہارات ہوتے ہیں اور بڑے اشتہارات انھیں رسائل کو ملتے ہیں جن کی تعداد اشاعت پانچ ہزار کے اوپر ہوتی ہے۔

سردار جعفری کے بیان کے خلاصے کے بعد اور میرے تجربے میں بظاہر کوئی مطابقت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اس کا تعلق مجوزہ کنونشن سے اتنا ہی ہے جتنا سردار جعفری کے ان الفاظ سے ان کے پورے مضمون کا کہ

"اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ حکومتوں کے تعاون کے بغیر ہم خود اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے لیے کیا کرسکتے ہیں"

دراصل اردو والوں نے آزادی کے بعد سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور ہی نہیں کیا کہ حکومتوں کے تعاون کے بغیر اردو کو کس طرح زندہ کیا جاسکتا ہے اور وہ کیا ذرائع ہیں جن کو بروئے کار لاکر ہم اردو کو اتنی مقبول بنادیں کہ غیر اردو والے اس کی حقیقی قدر و قیمت کی طرف از خود متوجہ ہوں آزادی کے بعد کے بیس برسوں میں سیکڑوں چھوٹی اور بڑی اردو کانفرنس بلائی گئیں تین تین دن اور ایک ایک ہفتہ ہم نے اردو کی بقا اور ترقی کے مسائل پر بحث و مباحثہ کیے بڑی بڑی تجویزیں بنائیں لمبے چوڑے بیانات دیے وضاحتیں لکھیں درخواستیں کیں لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ قول ہم کو متاثر نہ کرسکا کہ کسی بھی زبان کی بقا و ترقی صرف اسی کے چاہنے والوں کے عمل اور ایثار پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر حکومتوں کے تعاون اور گرانٹوں سے کوئی زبان پھیل سکتی اور ترقی کرسکتی تو ہندی کو بیس برسوں میں پورے ہندوستان کی مقبول ترین زبان بن جانا چاہیے تھا جس کی بقا کے لیے قانون بنائے اور ترقی کے لیے قومی خزانے سے اربوں روپے خرچ کیے جاچکے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے میں ہندی کو دل سے قبول نہیں کیا گیا ہے اور وہ قومی یکجہتی کی بجائے انتشار کا باعث بن گئی ہے۔

اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک "جادو" ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی شدید ترین اور طاقتور مخالفت کے باوجود مری نہیں بلکہ ان دلوں میں بھی جا بسی جنھوں نے اسے زبان اور تحریر سے نکال دیا اگر اردو والے اپنی زبان کو اس سب سے بڑی فطری صلاحیت کا راز پالیں اور اس پر مستقل مزاجی سے ایک ٹھوس منصوبے کے تحت عمل کرنے لگیں تو حکومتیں تو کیا اردو کے وہ دشمن بھی جو اسے غیر ملکی کہہ کر دیس نکالا دینا چاہتے ہیں اسی کے جادو کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

سردار جعفری نے اپنے بیان کے خلاصہ نمبر (۲) میں جو اشارہ کیا ہے وہ اس احساس کا نتیجہ ہے۔ لیکن جعفری نے جس وقت کا حوالہ دیا ہے وہ اپنے آپ کبھی نہیں آسکتا اس وقت کو لانا ہوگا اور اس کے لیے اردو والوں کو ہنگامی نہیں ٹھوس لائحۂ عمل مرتب کرنا ہوگا۔ ایک ایسی راہ نکالنی ہوگی جس پر چل کر اس وقت کو جو ابھی لاکھوں کوسوں دور

دکھائی دیتا ہے قریب سے قریب کیا جا سکتا ہے۔

کتابوں کے تاجروں نے اردو کے تمام اچھے لٹریچر کو تو دیوناگری میں منتقل کر دیا اور اس سے لاکھوں روپیہ بھی کمایا آج ہندی ادب کا ہر قاری کرشن چندر بیدی، خواجہ احمد عباس عصمت چغتائی ساحر، مجروح، سردار جعفری، شکیل، جگر، جوش، اقبال، غالب اور میر تک سے واقف ہے لیکن اردو ادب کے کتنے قاری ایسے ہیں جو یشپال، چترویدی، امرت لال ناگر، جینندر، پنت امرت رائے اور دھن کے نام سے واقف ہیں؟ حالانکہ ان ناموں نے بھی ادب کو وہی کچھ دیا ہے جو اردو کے ادیبوں اور دانشوروں نے دیا ہے لیکن پھر بھی اردو ادب کا قاری ان کے ناموں سے واقف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زبانوں پر امریکہ، یورپ اور روس کے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کے نام بلا تکلف آجاتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں؟ اس لیے کہ اردو رسالوں کے مدیروں نے ان کی تخلیقات کو وہ اہمیت نہیں دی جو غیر ملکی نامورں کو دی اردو والوں کے پاس کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو ہندی کے ادیبوں اور دانشوروں کو اردو میں منتقل کر کے اردو ادب کے قاریوں تک پہنچائے۔ کتابوں کے تاجر یہ کام آسانی سے کر سکتے تھے لیکن وہ گھاٹے کا سودا نہیں کرتے ہندی کے ادیبوں کو اردو کے قاریوں میں مقبول بننے کے لیے شروعات میں نقصان ہوگا ہی پھر دوسرا سوال ان تاجروں کے نزدیک اس معاوضہ کا ہوتا ہے جو ہندی کے ادیب مانگتے ہیں اردو کے ادیبوں کی طرح یہ کم سے کم میں بکنا پسند نہیں کرتے۔ ہندی کے بڑے ادیبوں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام صرف وہی ادارہ کر سکتا ہے جو اردو اور ہندی کے ادیبوں کو قریب لانے کا بامقصد نظریہ رکھتا ہو اور ایسا ادارہ اردو والوں کے پاس آج تو موجود نہیں ہے۔

ہمارے پڑوسی پاکستان نے اس نکتہ کو اسی وقت سمجھ لیا تھا جب وہاں بنگلہ اور اردو میں جنگ چھڑ گئی تھی آج وہاں اردو میں بنگلہ اور بنگلہ میں اردو ادب کو تیزی سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ ریڈیو پاکستان اپنی اردو نشریات میں مشرقی اور مغربی پاکستان بولنے کی بجائے پوربی اور پچھمی پاکستان بولتا ہے اسی طرح بنگلہ میں منتری کی جگہ وزیر بولا جاتا ہے۔ پاکستان کا ہر معیاری اردو رسالہ اپنے ہر شمارے میں کسی نہ کسی بنگلہ ادیب کی کہانی یا نظم کا ترجمہ شریک کرتا ہے۔ اسی طرح بنگالی زبان کے رسالوں کا حال ہے ان میں اردو زبان کے تمام اچھے ادیبوں کی تخلیقات کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔

ہندی میں "اردو ساہتیہ" ماہنامہ تو نکلتا ہے جس میں تمام مواد ادب اردو سے لیا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں "ہندی ادب" نام کا کوئی رسالہ نہیں نکلتا۔

کیا اردو والے ان تمام حقائق کے باوجود یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان اردو ادب کے ساتھ تعصب برتتی ہے؟

ناگپور میں جو ہندی کا نہیں مرہٹی ادب کا مرکز ہے برسوں سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ یہاں کے کوی سمیلنوں میں اردو کے شاعر مدعو کئے جاتے ہیں اور اردو کے مشاعروں میں ہندی کے کوی بلائے جاتے ہیں۔ ان دونوں بلکہ مرہٹی کے شاعروں کی شرکت کی وجہ سے بھی یہاں کے ادبی پلیٹ فارم سہ زبانوں کے ادب کا سنگم بن جاتے ہیں خیال جب تک زندہ رہا اس نے ایسی روایت کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی چنانچہ جشن دیوانِ خیال کی ہی بنیاد ہے۔ کل ہند اردو مصنفین کنونشن ناگپور کو ناگپور کے ہندی کے ادیبوں کا جتنا بڑا تعاون ملا اتنا خود اردو والوں سے نہیں ملا۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس اس جلسہ کے خصوصی مہمان تھے جو اسی کنونشن کے موقع پر یہاں کی ہندی ساہتیہ سمیلن نے کنونشن کے مہمانوں کے استقبال میں ہندی مورچہ میں کیا تھا۔

اس طرح کا تعاون ہندی والوں نے اردو والوں سے اگست ۱۹۶۷ء میں اس وقت کیا جب ناگپور یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل میں صرف ہندی اور مرہٹی کو ذریعہ تعلیم کی زبان بنانے کا پرپوزل پیش ہوا اور انجمن ترقی اردو (ہند) ودربھ نے ۱۹ راگست کو علاقہ گیر احتجاجی دن منایا اس دن کے جلسوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اکثر جلسوں کی صدارت ہندی یا مرہٹی کے دانشوروں نے کی اور ایک مرہٹی ذریعہ تعلیم کے کالج کے پرنسپل نے کونسل میں اس "پرپوزل" کے خلاف جس کے قانون بن جانے پر یونیورسٹی میں اردو کی پوزیشن غیر ملکی زبان کی سی ہو جاتی ۲۵ راگست کو تجویز پیش کی۔

اب پھر وہیں لوٹ آئیے جہاں سردار جعفری کہہ رہے ہیں "حکومتوں کے تعاون کے بغیر ہم خود اپنی زبان کی بقا و ترقی کے لیے کیا کر سکتے ہیں"؟

میرے خیال میں مجوزہ اردو کنونشن کا اہم ترین ایجنڈا سردار جعفری کا یہی جملہ ہونا چاہئے باقی مسائل پر اس کے بعد غور کیا جانا چاہئے۔ جب ہم طے کر لیں گے کہ ہم اپنی زبان کے لیے خود کیا کر سکتے ہیں تو باقی مسائل کے حل کی راہیں اپنے آپ نکل آئیں گی۔ (رفیق انصاری)

"ہماری زبان"

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

اردو کمیٹی شاخ دہلی کی تشکیل

نئی دہلی۔ وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس نئی دہلی میں اردو اور ہندی کے ادیبوں کی ایک غیر رسمی میٹنگ میں اردو کمیٹی بمبئی کے پروگرام اور منصوبوں سے تعاون کے لیے ایک سب کمیٹی (برائے دہلی) کی تشکیل عمل میں آئی۔ محمود ہاشمی کو اس سب کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ دیگر ممبران میں ڈاکٹر مہیب سنگھ (ہندی)، ڈاکٹر قمر رئیس، غلام ربانی تاباں، کیلاش ماہر، جاوید وششٹ، شارب ردولوی، دلیپ بادل کے نام شامل ہیں اس موقع پر اردو کمیٹی بمبئی کے رکن اور مشہور شاعر سردار جعفری نے اردو کے مطالبے اور اردو کمیٹی بمبئی کے مقاصد کی وضاحت کی۔ اردو کے مطالبے کو دیگر زبانوں اور خصوصاً ہندی کے دانشوروں اور فنکاروں کے تعاون سے حاصل کرنے کے لیے نیز اس مقصد کے تحت ایک ہندوستان گیر تحریک کا آغاز کرنے کے لیے اردو کے فنکاروں نے بمبئی میں اردو کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ اس کمیٹی کے صدر کرشن چندر ہیں۔ نائبین صدر میں ڈاکٹر ملک راج آنند، راجندر سنگھ بیدی، اور شام کشن نگم شامل ہیں۔ ایگزیکیوٹیو کمیٹی خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، اعجاز صدیقی، اور دیگر مشہور فنکاروں پر مشتمل ہے۔

اردو کمیٹی وسط جنوری میں بمبئی میں ایک کانفرنس منعقد کر رہی ہے جس میں ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کے ادیب اور دانشور اردو کے مطالبے کی حمایت کے لیے شرکت کریں گے۔ (نامہ نگار)

ناگپور یونیورسٹی کا اقلیتی زبانوں کے سلسلے میں ناروا سلوک

اخبارات میں پھر خبریں آنے لگی ہیں کہ ناگپور یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل میں ایک بار پھر وہی پروپوزل پیش ہوا ہے۔ یا ٹھنڈے بستے سے نکال لیا گیا ہے جس کے ذریعہ اردو سمیت دوسری اقلیتی زبانوں کو ڈگری کورس سے خارج کر دیا جائے گا۔ یہ پروپوزل دراصل گذشتہ سال ۲۵ و ۲۶ر جون کو کونسل کی میٹنگ میں زیر بحث لایا گیا تھا لیکن بنگالی زبان کے حامیوں کی مخالفت کی وجہ سے اگلی میٹنگ کے لیے اٹھا دیا گیا تھا اسی درمیان انجمن ترقی اردو (ہند) ودربھ نے محسوس کیا کہ اکاڈمک کونسل میں کچھ بااثر شخصیتیں ایسی ہیں جو اس پروپوزل کی آڑ میں ڈگری کورس سے اردو زبان کا خاتمہ کر دینا چاہتی ہیں چنانچہ اس نے اس پروپوزل کے خلاف ۱۹ راگست ۱۹۷۶ء کو سارے ودربھ میں یوم اردو منا کر سخت احتجاج کیا اس تاریخ کو ودربھ کے گوشے گوشے سے حامیان اردو کے ساتھ بنگالی اور پنجابی زبان کے حامیوں نے بھی احتجاجی تجویزیں پاس کر کے چانسلر ناگپور یونیورسٹی، وزیر اعلیٰ مہاراشٹر اور اندرا گاندھی کے نام احتجاجی خطوط ہزاروں کی تعداد میں بھیجے جس کے نتیجے میں کونسل کی میٹنگ منعقدہ ۴ر ستمبر ۱۹۷۶ء میں کونسل کے ایک ممبر جناب ایم جی ڈھوٹے پرنسپل جگدمبا کالج اچل پور نے اس پروپوزل کے خلاف ایک تجویز رکھی کہ یہ پروپوزل اکاڈمک کونسل کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اسے واپس لیا جائے۔ اس سے پہلے ہی حامیان اردو کے احتجاج کا دباؤ پڑ چکا تھا چنانچہ پروپوزل کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اب ٹھیک ایک سال کے بعد اسی پروپوزل کو کونسل میں دوبارہ لایا گیا ہے۔ گذشتہ سال نومبر میں ہی جب ناگپور میں موسم سرما کا اسمبلی سیشن جاری تھا جناب سید الٰہی ایم۔ ایل۔ اے قائم مقام اسپیکر کی سرکردگی میں ایک ایسا وفد جس کو اردو کی نمائندگی کا حق حاصل نہیں تھا۔ وائس چانسلر سے ملا تھا اس وفد کے ایک ذمہ دار رکن نے انجمن ترقی اردو ناگپور کے ایک جلسۂ عام جو جناب شنکر راؤ چوہان وزیر حکومت مہاراشٹر کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا اور جس میں سید الٰہی صاحب وعدے کے باوجود شریک نہیں ہوئے کہا تھا کہ وائس چانسلر نے پروپوزل واپس لینے کا وعدہ کیا ہے اردو والوں کو فضول چیخ پکار نہیں کرنی چاہیے۔ اور اسی جلسے میں سکریٹری انجمن ودربھ شاخ کی تقریر کے جواب میں جناب شنکر راؤ چوہان نے یقین دلایا تھا کہ یونیورسٹی اردو کے ساتھ بے انصافی نہیں کرے گی اور اگر کبھی ایسا ہوا تو میں اردو والوں کا ساتھ دوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت کانگریس کے لیڈروں اور وزیروں نے ہونے والے الیکشن کے زیر اثر یونیورسٹی پر دباؤ ڈالے تھے یا واقعی وہ اردو کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے تھے لیکن آج جب پھر یہ مسئلہ سامنے آیا ہے اور اکاڈمک کونسل میں وہی مراٹھی ہندی اور انگریزی ہی ڈگری کورس کی زبانیں رہیں گی کا پروپوزل پیش ہوا ہے تو کانگریس کے لیڈروں اور وزیروں کو اپنے وعدے کیوں نہیں یاد آتے۔ آج میرے پاس ودربھ کے گوشے گوشے سے یونیورسٹی کے اس اقدام کے بارے میں خطوط آ رہے ہیں انجمن کی شاخیں اور دوسرے ادارے مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ یونیورسٹی اکاڈمک کونسل نے پھر کیوں وہی پروپوزل مختلف لایا کیا اس لیے کہ الیکشن گزر گیا اور ودربھ میں کانگریس ایک بڑی اکثریت سے جیت گئی۔ اب بتایا جائے کہ پھر ہمیں کون سا قدم اٹھانا ہوگا۔ خاص طور سے اردو کے طلبہ میں سخت قسم کی برہمی پائی جاتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس پروپوزل کے منظور ہو جانے سے ان کا مستقبل تاریکی میں چلا جائے گا۔ لیکن چونکہ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو زبان کے تحفظ کے سلسلے میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی قائل نہیں ہے۔ اس لیے میں طلبہ کو مشورہ دوں گا کہ وہ صبر و ضبط سے کام لیں اور انجمن کی مقامی شاخوں میں جان پیدا کریں اس طرح ہم اردو زبان کے حق کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

اس مسئلے پر جلد ہی اردو کانفرنس بلانے پر غور کیا جا رہا ہے انجمن کی شاخوں سے درخواست ہے کہ وہ جلد ہی نئے الیکشن کر لیں تاکہ ان کی کانفرنس میں بھرپور نمائندگی ہو سکے۔

(نفیس انصاری)

سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) ودربھ کامٹی (ناگپور)

۱۹۶۶ء میں اردو ادب

انجمن اردوئے معلیٰ میں پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ

علی گڑھ ۲۹ نومبر۔ آج انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو کے ایک جلسے میں، پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو نے اپنا انگریزی مقالہ "اردو ادب ۱۹۶۶ء میں" پڑھا۔ اس مقالہ میں پروفیسر سرور نے کہا کہ اردو کی تعلیم اور فطری نشو و نما کے لیے وہ آسانیاں اور مواقع حاصل نہیں ہیں جس کی اردو ہر طرح مستحق ہے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۶۶ء میں اردو ادب کی رفتار معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے تسلی بخش اور حوصلہ افزا ہے۔ سرور صاحب نے اپنے اس مقالے میں شاعری، تنقید، تحقیق و تدوین اور افسانے کی ان تمام اہم اور قابل ذکر کتابوں کا جائزہ لیا جو ۱۹۶۶ء میں شایع ہوئیں اور ان کتابوں کے حوالے سے ادب و شعر کے نئے رجحانات اور تحقیق و تنقید کے نئے میلانات کا تجزیہ کیا۔ ادبی رجحانات اور علمی میلانات پر تبصرے کے ساتھ ساتھ پروفیسر سرور نے اپنے مقالے میں بعض نئے رسائل کے اجرا، ان کے مقاصد اور معیار کا ذکر بھی کیا۔ پروفیسر سرور نے ۱۹۶۶ء میں الٰہ آباد سے شایع ہونے والے ماہنامہ 'شب خون' کا خصوصیت سے ذکر کیا۔

مقالے پر بعض حضرات نے سوالات کیے۔ سوالات میں سرور صاحب سے اس بات کی وضاحت چاہی گئی تھی کہ کلیم الدین احمد کی شاعری کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی اور نیاز فتح پوری کی وفات کا تذکرہ اس جائزے میں کیوں شامل کیا گیا تھا۔ نئی شاعری اپنی پیشرو شاعری سے بہتر ہے، 'شب خون' جیسے سطحی معیار رکھنے والے رسالے کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیوں کیا گیا ہے۔ کیا اپنے ہم عصر ادب پر اچھی اور معنی خیز تنقید ممکن ہے یا اس کے لیے وقت کا فاصلہ ضروری ہے وغیرہ وغیرہ۔

سرور صاحب نے ترتیب وار ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کلیم الدین کا دوسرا مجموعہ 'پچیس نظمیں' کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گہرے مطالعہ کو شگفتہ اور رواں زبان میں کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں شاعری کے بہت سے عناصر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی شاعری میں اس آنچ کی کمی ہے جو شاعری کے لیے ضروری ہے لیکن شاعری صرف اس 'آنچ' کا نام بھی نہیں ہے۔ کلیم الدین کی نظموں میں شاعری کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے میں ہمیں ان کی تنقیدوں کے تاثرات کو ذہن سے نکالنا ہوگا، اسی وقت ہم ان کی شاعری کے حسن کو سمجھ سکیں گے۔

سرور صاحب نے نیاز فتح پوری کی وفات کے ذکر کے سلسلے میں کہا کہ کسی عہد ساز ادیب کی وفات بھی ادب کی دنیا میں اتنا ہی بڑا واقعہ ہے جتنا بڑا کسی نئی کتاب کی اشاعت۔ اس طرح ہم اپنے اس ماضی کا جائزہ لیتے ہیں جس کے سائے میں ہمارے ادبی شعور کی تربیت ہوتی ہے۔ نیاز ان بڑے ادیبوں میں سے تھے جنھوں نے کئی نسلوں کے ذہن و شعور کو متاثر کیا ہے اس لیے ان کا ذکر اور ماضی کے ادبی کارناموں پر مختصر تبصرہ اس جائزہ میں ہر طرح ضروری تھا۔

نئی شاعری کے سلسلے میں سرور صاحب نے کہا کہ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ نئی شاعری انسان اور کائنات کو نئے تلازموں میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ غدر کے بعد سے ہمارا ادب تحریکات کا ادب رہا ہے۔ میرے خیال میں نئی شاعری میں پہلی بار اب زندگی کو آزادانہ طور پر دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور ادب کو ادب کی حیثیت سے پرکھا جا رہا ہے اور یہ بات قابل قدر ہے۔

'شب خون' کے سلسلے میں سرور صاحب نے صرف اتنا کہا کہ ہو سکتا ہے بعض لوگ اس رسالے کے اجرا کو ادب کے حق میں مضر سمجھتے ہوں لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس رسالے نے ادب کے جدید میلانات کو سامنے لانے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ اس میں جو تبصرے شایع ہوتے ہیں ان کا معیار اچھا ہے اور سب سے قابل قدر چیز اس کی اشاعت کی پابندی ہے۔

ہم عصر ادب اور تنقید کے سلسلے میں سرور صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ہم عصر ادب پر معروضی تنقید ممکن نہیں ہے اس لیے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب یہ ادب تاریخ کا حصہ بن جائے۔ میرے خیال میں یہ رویہ تنقید کے صحیح اور حقیقی مفہوم سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ تنقید کا کام تو یہی ہے کہ وہ اپنے معاصر ادب پر نظر رکھے، اس کے کھرے کھوٹے کو جس حد تک ممکن ہو سمجھے اور سمجھائے ہی نہیں بلکہ ماضی کو بھی حال کے آئینے میں دیکھے۔ یہ حال اپنے طور پر ماضی کو دریافت کرتا ہے۔ اور ادب کا عمل اس وقت صحیح خطوط پر شروع کیا جا سکتا ہے جب کہ نقاد حال کے پیچ و خم سے اپنے کو آشنا رکھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات ہم عصر ادب کے بارے میں ناقدین کے فیصلے یک طرفہ اور جانب دار بھی ہوتے ہیں اور بعد میں ان فیصلوں کو بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن صرف اس امکان کی وجہ سے ہم اپنے حال کو سمجھنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ ادب کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ادب میں گھپلا بہت زیادہ دنوں نہیں چل سکتا اور بالآخر فیصلے ادبی معیاروں پر ہوتے ہیں۔ ادب کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ سکریٹری کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ (نامہ نگار)

اردو کے قیمتی ادبی سرمایہ کے تحفظ کی کوشش ضروری

لکھنؤ۔ گورنر جناب بی۔ گوپالا ریڈی نے آج یہاں کہا کہ ہندوستان

کی رنگا رنگ تہذیب تمدن اور زبانوں میں اردو کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کے استعارے اور تشبیہات دوسری زبانوں سے زیادہ حسین ہیں۔ اس قیمتی سرمایہ کے تحفظ کے لیے جد و جہد کرنا چاہیے لیکن اسے سیاسی سوال بنا کر کسی اکھاڑے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

گورنر ادارہ فروغ اردو ہند کی جانب سے دئے گئے ایک استقبالیہ میں تقریر کر رہے تھے انھوں نے کہا ہندی اور اردو دونوں کے رسم خط الگ الگ ہیں بعض لوگ اسے ہندی کی شیلی بتاتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے اتنا تو ضرور صحیح ہے کہ دونوں زبانوں میں افعال مشترک ہیں لیکن دونوں زبانیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور اردو میں شیرینی بھی ہے اور اسے نہ جاننے والے بھی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی پھلنے پھولنے کی تمام سہولتیں ملنا چاہیے۔ گورنر نے کہا کہ اردو کے تین مراکز حیدرآباد دہلی اور لکھنؤ ہیں خوش قسمتی سے میں نے ان تینوں جگہوں کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اس لیے آپ مجھے "اردو والا" ضرور کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے جو لوگ اسے اسلام سے وابستہ کرنے کی بات کہتے ہیں یہ غلط اور تنگ نظری ہے کیونکہ متعدد اسلامی ملکوں کی زبان اردو نہیں بلکہ دوسری زبانیں ہیں گورنر نے کہا دور کیوں جائیے کشمیری پنڈتوں کی زبان اردو ہے۔ ادارے کی جانب سے کہا گیا ہے کہ ادارہ فروغ اردو تیلگو اور ہندی تینوں زبانوں میں یونیورسٹی کی سطح پر جو طلبہ سب سے زیادہ نمبر حاصل کریں گے، ادارہ ایک سو بیس روپے ماہوار کا وظیفہ دے گا یہ وظیفہ پانے کے وہی طلبہ مستحق ہوں گے جن کی مادری زبان اردو نہ ہوگی۔ (قومی آواز)

آزادی کی منزلوں میں اردو کا اجالا شامل ہے

بھوپال میں مشہور ترقی پسند شعراء علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی آمد پر مختلف ادبی پروگرام ہوئے۔ حمیدیہ کالج میں مشاعرہ ہوا سیفیہ کالج میں کیفی اعظمی کی تقریر ہوئی جس میں آپ نے کہا کہ قوم اسی وقت مہذب ہو سکتی ہے جب اس کے پاس اپنی شاعری کا ذخیرہ موجود ہو۔ انڈو سوویت ایسوسی ایشن کی ایک عام تقریب میں کیفی صاحب اور جعفری صاحب نے سوویت انقلاب کے اردو ادب پر اثرات کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ میں تقریریں کیں۔ اس کی صدارت جناب اختر سعید نے کی۔ ایسوسی ایشن کے ایک مشاعرہ میں بھی کیفی اعظمی نے حصہ لیا۔ سردار اور کیفی نے اپنی تقریروں میں کہا کہ آزادی کی منزلوں میں اردو کا اجالا شامل ہے اردو نے انقلابی شاعری کو بہت کچھ دیا ہے لکشمی بائی گرلز کالج میں بھی سردار اور کیفی کا استقبال کیا گیا۔ سردار نے اپنی متعدد نظمیں قتل آفتاب، میرا سفر، صبح فردا

وغیرہ اور کیفی نے مذہبی فسادات، تضاد، عادت وغیرہ سنائیں۔ پروفیسر آفاق احمد نے تعارف کرایا اور کماری آشا سود چیرمین کالج یونین نے شکریہ ادا کیا۔ (نامہ نگار)

پونا میں اردو اکاڈمی کا قیام

پونا میں ہندی اور اردو کے ادیبوں اور شعرا کی ایک اچھی تعداد موجود ہے لیکن اردو ادیبوں اور شاعروں کا کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جو اردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے باقاعدہ علمی بنیاد پر کام کرے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے اردو اکاڈمی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اکاڈمی کا انتخابی جلسہ ۱۲ نومبر کو پونا کی مشہور درسگاہ مولانا ابوالکلام آزاد اینگلو اردو ہائی اسکول میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر امانت نے فرمائی۔ آغاز میں جلسے کے داعی حضرت متین سروش نے اردو اکاڈمی پونا کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور شرکاء میں سے بعض حضرات کے سوالوں کے جواب دیے اور ضروری تقریریں کیں۔ اردو اکاڈمی پونا کے لیے حسب ذیل عہدیدار باتفاق آرا منتخب کئے گئے۔

۱۔ مشیر اعلیٰ ——— جناب جلال الدین وکیل
۲۔ صدر:۔ پروفیسر امانت صاحب
۳۔ سکریٹری:۔ حضرت متین سروش صاحب
۴۔ خازن:۔ سید حبیب احمد صاحب
۵۔ پروپیگنڈہ سکریٹری:۔ مرزا صلوٰۃ بیگ
۶۔ اسسٹنٹ پروپیگنڈہ سکریٹری:۔ جناب کے۔ پی۔ ماسٹر۔

مجلس عاملہ کے لیے حسب ذیل حضرات کا انتخاب عمل آیا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر رام چندر شری واستو، جناب پی۔ بی۔ سکسینہ "سحر"، حضرت علمی برنی، جناب پی۔ ڈی سبحانی، محترمہ خورشید نکہت، جناب ایف۔ ایم پرویز، جناب اطہر علی، جناب اطہر انصاری، جناب مطیع اللہ اور جناب فضل حسین رفیق۔ (متین سروش)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا